مظہر محمود شیرانی*
طارق علی شہزاد**

باغ و بہار کے دو بہترین تدوینی نسخوں کے مقدمات کا تقابلی مطالعہ

یہ بات روزِ اوّل ہی سے متنازعہ فیہ رہی ہے کہ اختلاف کی اہمیت کیا ہے؟ ہر میدان میں ہمیشہ سے اختلاف باعثِ رحمت بھی ثابت ہوئے اور باعثِ زحمت بھی۔علم و فضل اور تحقیق کے میدان میں بھی یہی صورتِ حال موجود ہے۔محققین کے درمیان اختلافات نے ہمیشہ نئے آنے والوں کے لیے سوچ بچار اور تحقیق کے نئے در وا کیے ہیں اور کبھی کوئی دروازہ بند نہیں دیکھنے میں آیا۔تدوین کے میدان میں یہ اختلافات بالخصوص ابھر کر سامنے آتے ہیں۔میر امّن کی باغ و بہار کی تدوین بھی اس سے مبرا نہیں ہے۔باغ و بہار کا شمار اردو کی اہم ترین داستانوں میں کیا جاتا ہے۔فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اس پلیٹ فارم سے کئی داستانیں ابھر کر سامنے آئیں لیکن شہرت کے بامِ عروج پر جو داستان پہنچی وہ باغ و بہار ہی ہے۔اس داستان کی تدوین اور تحقیق کا سلسلہ پچھلی دو صدیوں سے جاری ہے اور شاید آنے والے وقت میں بھی جاری رہے۔اس کی تدوین کے سلسلے میں بڑے بڑے کام دیکھنے میں آئے اور اس کے مدوّنین کی فہرست میں بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسے نام بھی شامل ہیں تاہم جس معیار کے کام کی باغ و بہار جیسی عظیم الشان اور سدا بہار داستان متقاضی تھی، اس کو صرف دو

محققین پورا کر سکے ہیں یعنی رشید حسن خاں اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ۔ دونوں کا کام معیاری ہے لیکن دونوں نے ایک دوسرے کے کام کو ہدفِ تنقید بنایا ہے اور اس کے لیے ٹھوس داخلی اور خارجی شہادتیں پیش کی ہیں جس کی وجہ سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ باغ و بہار کے دونوں تدوینی نسخوں کا تفصیلی جائزہ لے کر کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

باغ و بہار کے بارے میں بحث کی ابتدا اس وقت ہوئی جب لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامہ نقوش کی دسمبر ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا مقالہ "میر امّن دِلّی والے" شائع ہوا۔ اس مقالے میں انھوں نے عبدالغفور نساخ کے تذکرے سخن الشعراء اور دیگر کتب کے حوالے سے دعویٰ کیا کہ حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ سے وابستہ میر امان علی اصل میں میر امّن دِلّی والے ہی ہیں اور گردشِ ایام نے ان سے زندگی کے وہ اوراق چُرا لیے ہیں۔ اُن کے مطابق وہ ۱۸۰۶ء میں فورٹ ولیم کالج چھوڑنے کے بعد سے لے کر تقریباً ۱۸۴۰ء تک نہ صرف زندہ رہے بلکہ حیدرآباد دکن کے دارالترجمہ سے بہت اعلیٰ پائے کے تراجم بھی کرتے رہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے کافی دلائل بھی دیے۔ جس وقت ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا یہ مقالہ سامنے آیا اس وقت تک رشید حسن خاں باغ و بہار مکمل کر چکے تھے اور نقوش پریس، لاہور میں دہلی سے کتابت شدہ کاپی بھی چھپنے کے لیے پہنچ چکی تھی۔ اِس مقالے کی اشاعت کے بعد انھوں نے فوری طور پر باغ و بہار کی اشاعت کا کام روک دیا اور ان سوالات کے جواب ڈھونڈنے لگے جو ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اپنے مقالے میں اٹھائے تھے۔ اِس کام میں اُن کو ڈھائی سے تین سال کا عرصہ لگ گیا تاہم انھوں نے اپنی مرتبہ باغ و بہار کے مقدمے میں ان تمام متنازعہ امور کا جواب دینے کی حتی الوسع کوشش کی جو اس مقالے کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں ڈاکٹر گیان چند کی کتاب تحقیق کا فن سامنے آئی جس میں انھوں نے اپنا وزن عملی طور پر رشید حسن خاں کے پلڑے میں ڈال دیا اور اُن نظریات کو یکسر مسترد کر دیا جو ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اپنے مقالے میں پیش کیے تھے۔

> قیاس کو واقعہ بنا دینے کی لغویت آمیز مثال رشید حسن خاں نے اپنی مرتبہ باغ و بہار (دِلی ۱۹۹۲ء) کے مقدمے میں دی ہے۔ پاکستان کے مرزا حامد بیگ نے نقوش، لاہور بابت دسمبر ۱۹۸۷ء میں مضمون لکھا "میر امّن دِلّی والے"۔ اِس میں اُنھوں نے

> قیاس کے پتنگ کی ڈور کچھ زیادہ ہی بڑھا دی ہے۔ ناسخ کے تذکرے سخنِ شعرا میں جان صاحب ریختی گو کے والد کا نام میر امن لکھنوی لکھا ہے۔ اس سے بیگ صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ جان صاحب، میر امّن کے بیٹے تھے (مقدمہ باغ و بہار ص ۳۷) حیدر آباد کے نواب شمس الامرا نے دارالترجمہ کی کتاب ستۂ شمسیہ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "میر امان دہلوی اور غلام محی الدین حیدر آبادی کو حکم ہوا کہ علومِ مذکورہ کو انگریزی سے اردو زبان میں ترجمہ کریں۔" اس کی بنا پر مرزا حامد بیگ نے دعویٰ کر دیا کہ فورٹ ولیم کالج سے الگ ہو کر میر امن دارالترجمہ حیدر آباد میں ملازم ہو گئے (ایضاً، ص ۴۷) ان کے نزدیک میر امان نام تھا میر امن کا۔[1]

ڈاکٹر گیان چند کا یہ اقتباس کچھ چیزوں کو واضح کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اوّل یہ کہ انھوں نے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا یہ مقالہ پورا نہیں پڑھا بلکہ صرف اُن چیزوں کو دیکھا جو رشید حسن خاں نے اپنی کتاب میں بیان کی تھیں۔ اسی وجہ سے انھوں نے رشید حسن خاں کی مرتبہ کتاب کا حوالہ دیا ہے، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے مقالے کا براہِ راست حوالہ نہیں دیا۔ دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر گیان چند نے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے نظریات کو محض بیک جنبشِ قلم مسترد کیا ہے، اس کے خلاف کوئی جوابی نظریہ پیش نہیں کیا اور نہ وہ اسباب بتائے جو اس نظریے کے ردّ کی بنیاد بنے۔ انھوں نے آنکھیں بند کر کے رشید حسن خاں کے باغ و بہار کے مقدمے میں پیش کیے گئے دلائل پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی جس سے تحقیق کے طالب علموں کو تشنگی کا احساس ضرور باقی رہتا ہے۔ جب کہ مرزا حامد بیگ نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ٹھوس دلائل پیش کیے ہیں۔ انھوں نے عبدالغفور ناسخ کے تذکرے سخنِ شعرا، سیّد محمد مبین نقوی الہ آبادی کی کتاب تاریخِ ریختی مع دیوانِ جان صاحب، محمد عبداللہ خاں خویشگی کی فرہنگِ عامرہ اور گارسیں دتاسی کے ایک لیکچر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ جان صاحب کے والد کا نام محمد امّن تھا اور ۱۸۰۶ء کے بعد جان صاحب کے والد ہونے کے حوالے سے میر امّن کا فرخ آباد اور لکھنؤ سے تعلق قائم رہا جس سے میر امّن کی طویل العمری بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ اس پر رشید حسن خاں اور گیان چند کو سب سے بڑا اعتراض تھا۔ اس کے بعد ۲۰۰۴ء میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی مرتب شدہ باغ و بہار از میر امن دِلّی والے سامنے آئی۔ اس کتاب کے مقدمے میں مرزا

حامد بیگ نے نہ صرف اپنے نقوش والے مقالے کا دفاع کیا بلکہ ان تمام الزامات کا بھی جواب دینے کی سعی کی جو رشید حسن خاں نے اپنی مرتبہ باغ و بہار کے مقدمے اور ڈاکٹر گیان چند نے تحقیق کا فن میں اٹھائے تھے۔ یوں تشنگانِ علم کے سامنے بہت سے ایسے گوشے وا ہوئے جو اب تک بند تھے۔ تاہم یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ دونوں تدوینی نسخے اعلیٰ پائے کے ہیں اور اِن میں اُن تمام امور کا خیال رکھا گیا ہے جو ایک اچھی تدوین کے لیے لازمی خیال کیے جاتے ہیں۔

کسی بھی نسخے کی تدوین میں اس کے مآخذ کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ رشید حسن خاں نے سب سے پہلے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ اب تک میر امّن کا لکھا ہوا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہے کیونکہ تحریر ہونے کے فوراً بعد یہ کتاب چھپ گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے خطی نسخے ملنے کے امکانات بہت معدوم ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی تدوین کے لیے انڈیا آفس لائبریری، لندن کے نسخے بعنوان چہار درویش کو منتخب کرنے کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس نسخے کو ڈاکٹر حامد بیگ نے اس وجہ سے ہدفِ تنقید بنایا ہے کہ یہ خطی نسخہ نہیں ہے۔ اس کا ترقیمہ موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ نسخہ نہ تو میر امن کے ہاتھ کا لکھا ہے اور نہ مصنف کی تصدیق شدہ نقل ہے۔ اس کی ابتدا میں کوئی ایسی تحریر بھی نہیں ملتی جو اس نسخے کی حقیقت بیان کر سکے۔ اس کے علاوہ رشید حسن خاں کے اِس بیان کی روشنی میں کہ ''بعض مقامات پر متن کی ایسی غلطیاں بھی دکھائی دیتی ہیں جو اس خطی نسخے کو کم سواد ثابت کرتی ہیں'' ڈاکٹر حامد بیگ نے اس نسخے کی صحت کو چیلنج کیا ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے باغ و بہار کے کچھ ایسے نسخوں کے بارے میں بھی بتایا ہے جو اگر دستیاب ہو جائیں تو باغ و بہار کو اس کی اصل شکل میں تدوین کرنا آسان ہو جائے گا۔ مرزا حامد بیگ سب سے پہلے ڈنکن فاربس کے دعوے کی روشنی میں اس نسخے کی بات کرتے ہیں جو میر امن نے خود اپنے ہاتھ سے تحریر کیا تھا اور ڈاکٹر گل کرسٹ کو پیش کیا تھا۔ ڈنکن فاربس ہی کے مطابق ایک اور نسخہ موجود تھا جو میر امن کے شاگرد مسٹر رومر نے تحریر کیا تھا اور اس کی تحریر میر امن کی زیرِ نگرانی ہوئی تھی۔ ڈنکن فاربس دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی باغ و بہار مطبوعہ ڈبلیو ایچ ایلن اینڈ کمپنی پال مال ایس ڈبلیو لندن، ۱۸۶۴ء مرتب کرتے وقت ان دو نسخوں سے استفادہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ڈاکٹر ثریا حسین کے حوالے سے ایک اور خطی نسخے کا ذکر کیا

ہے جو ۱۸۰۳-۱۸۰۲ء میں تحریر ہوا تھا۔ بدقسمتی سے آج ان تمام میں سے کوئی بھی نسخہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ مرزا حامد بیگ کے مطابق:

> ...... جب تک نظرِ ثانی شدہ باغ و بہار (تکمیل ۱۲۱۷ھ بمطابق مئی تا جون ۱۸۰۲ء) کا کوئی مصدقہ قلمی نسخہ سامنے نہیں آجاتا، تدوینِ متن کے سلسلے میں ہمیں مقابلہ متون ہی کرنا پڑے گا اور کسی مستند نسخے کی پیروی۔[۲]

ڈاکٹر حامد بیگ نے تدوین کے لیے باغ و بہار کے نسخۂ فیض اللہ (۱۸۴۳ء) کا انتخاب کیا اور اس کا موازنہ کئی ایک نسخوں کے ساتھ کیا۔ بقول مرزا حامد بیگ:۔

> میں نے باغ و بہار کا نسخۂ فیض اللہ، مرتبہ فاضل مولویان (نظر ثانی شدہ ایڈیشن) مطبوعہ کلکتہ ایل مینڈلیس، کمرشل ایڈورٹائزرز پریس، طبع چہارم ۱۸۴۳ء (جس پر فورٹ ولیم کالج کی بیضوی مہر ثبت ہے) کو چنا۔ یہ نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری (اورینٹل سیکشن) میں کلاس نمبر ش ۴۳۳-۸۹۱ء بک نمبر ۱۶۸۸۱ کے تحت موجود ہے اور اس کی ایک کاپی میرے ذاتی ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے۔[۳]

اِس نسخے کے انتخاب کی جو وجوہات مرزا حامد بیگ نے بیان کی ہیں اُن کے مطابق پہلی وجہ اس کی عمدہ پیرابندی ہے۔ قوسین کے استعمال کو مرزا حامد بیگ نثری آہنگ مجروح ہونا گردانتے ہیں جو اس نسخے میں استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر نسخوں میں عنوانات کو تبدیل کیا گیا جب کہ نسخۂ فیض اللہ اس سے مبرا ہے۔ دیگر نسخوں میں مقابلہ متون اور ضمیمہ جات کے ذریعے جو کچھ نتائج ملتے ہیں ان سے کوئی حتمی نتیجہ نہیں ملتا جب کہ نسخۂ فیض اللہ سے حتمی نتائج برآمد ہوئے۔ رشید حسن خاں کے مرتب کردہ مواد میں قوسین کا استعمال ملتا ہے جو میر امن کے عہد کی چیز نہیں۔ اس کے علاوہ اس نسخے کے سرورق پر much improved لکھا ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نسخے کا موازنہ گذشتہ کئی متون سے کیا گیا اور اس کو ان سے بہتر قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس نسخے کے متن کا دیگر متون سے موازنہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اس نسخے کی تیاری میں میر امن کے خطی نسخے یا خطی نسخے کی مصدقہ نقل کو مدِنظر رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے مرزا حامد بیگ نے اس نسخے کو مستند قرار دیتے ہوئے ماخذ کے طور پر منتخب کیا۔

باغ و بہار کا ماخذ کیا تھا؟ اس پر ہر تدوین میں سیر حاصل بحث ملتی ہے۔ میر امن نے باغ و بہار کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ قصہ حضرت امیر خسروؒ نے اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ کی بیماری کے دنوں میں تخلیق کرکے انھیں سنایا تھا اور انھوں نے دعا دی تھی کہ جو شخص یہ قصہ سنے گا وہ صحت یاب ہوگا۔ مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر گیان چند نے یہ دلائل ثابت کیا ہے کہ قصۂ چہار درویش کسی صورت بھی حضرت امیر خسروؒ کی تالیف نہیں۔ یہ خاصے عرصے بعد کی تالیف ہے۔ یہ قصہ صرف بوجۂ عقیدت یا عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ان سے منسوب کردیا گیا ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی کی دلیل قابلِ غور ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

> مسلمانوں میں قصوں اور افسانوں کے متعلق ہر زمانے میں تعصب رہا ہے۔ علمائے کرام مخربِ اخلاق قصوں کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں ۔۔۔۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر امیر خسروؒ کو اس کا مصنف بتا کر اور نظام الدین اولیاءؒ سے تبریک دلوا کر مرتّبِ قصہ نے اس کو مقبولِ عام بنانے کی غرض سے دروغِ مصلحت آمیز والا حیلہ تراشا ہو۔ نیم مذہبی قصوں میں مصنفین قاری و سامع کو ثوابِ دارین کی بشارت اکثر دیا کرتے ہیں۔[۴]

مرزا حامد بیگ نے بھی باغ و بہار کے مآخذ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ باغ و بہار کی پہلی اشاعت میں سرورق پر باغ و بہار کا ماخذ فارسی قصۂ چہار درویش کا فارسی سے کیا گیا اردو ترجمہ نوطرزِ مرصع از عطا حسین خاں لکھا ہے تاہم مرزا حامد بیگ کے مطابق نہ تو یہ ترجمہ ہے اور نہ طبع زاد بلکہ بازتخلیق یا re-creation ہے۔ اس چیز پر مولوی عبدالحق نے میر امن پر سرقے کا الزام بھی لگایا تھا۔ مرزا حامد بیگ نے بھی کئی وجوہات کی بنیاد پر امیر خسرو والی روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق امیر خسرو کی طلسماتی شخصیت سے متاثر ہو کر جس طرح اور بہت سی چیزیں ان سے منسوب کی گئی ہیں اسی طرح باغ و بہار بھی بلا جواز ان سے منسوب کر دی گئی ہے۔ امیر خسرو کا تعلق بلبن کے دور سے تھا۔ اس کے بعد صدیوں تک اس قصے کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ اکبر کے عہد میں سنسکرت کے بہت سے شاہکار فارسی میں ترجمہ کیے گئے لیکن اس دور میں بھی ہمیں اس قصے کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ قصۂ چہار درویش کا مصنف کوئی شیعہ دکھائی دیتا ہے جب کہ امیر خسرو سنی

العقیدہ تھے۔ اس میں جن شعرا کا کلام شامل ہے وہ امیر خسرو کے بہت بعد کے ہیں۔ اس کے علاوہ اِس قصے کی زبان اُس زبان سے بہت مختلف ہے جو امیر خسرو کے دور میں بولی یا لکھی جاتی تھی۔ اِس بنیاد پر یہ کہنا کہ امیر خسرو نے یہ قصہ لکھا، درست معلوم نہیں ہوتا۔

رشید حسن خاں نے بھی اِس بات کو رد کیا ہے کہ قصۂ چہار درویش کا تعلق امیر خسرو سے ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ میر امّن کی باغ و بہار کا منبع تحسین کی داستان نو طرز مرصع تھی جب کہ مرزا حامد بیگ نے ان کی اس بات کو بھی غلط قرار دیا۔ رشید حسن خاں صحیح سوال اٹھاتے ہیں کہ جب تحسین کے ہاں امیر خسرو والی روایت موجود نہیں ہے تو پھر یہ روایت میر امّن تک کیسے پہنچی؟ ان کے قیاس میں امیر خسرو کی روایت میر امّن نے اس قصے کو شہرت دینے اور متبرک بنانے کے لیے خود گھڑی تھی۔ ان کے مطابق:

> ـــــ یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ اِس روایت کو خود انھوں نے بنایا ہو، اس قصے کو عظمت اور اس کے نتیجے میں خاص وقعت اور شہرت دینے کے لیے ـــــ میر امّن کے اس بیان کے سوا، ان سے پہلے یا ان کے زمانے میں اور کہیں اب تک یہ روایت دیکھنے میں نہیں آئی ہے اور اسی سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ انھی کی بنائی ہوئی ہے۔[۵]

اب رہ گیا یہ سوال کہ اگر امیر خسرو اس قصے کے تخلیق کار نہیں ہیں تو پھر کون ہے؟ اس حوالے سے مرزا حامد بیگ کی مرتب کردہ باغ و بہار میں تفصیلی بحث ملتی ہے۔ انھوں نے پہلی بار بتایا کہ قصۂ چہار درویش کے مصنف کے طور پر ایک نام حاجی ربیع العجب کا لیا جاتا ہے۔ مصحفی کے تذکرے عقد ثریا کے مطابق حاجی ربیع العجب اندلس کا رہنے والا تھا۔ کم عمری میں وہ اندلس سے اصفہان پہنچا اور تیس سال وہاں قیام کیا۔ بعد میں حج کر کے سیر و سیاحت کرتا ہوا وہ ہندوستان آ گیا۔ یہاں اس نے اپنی عبادت گزاری اور علم و فضل سے ایک نمایاں مقام حاصل کیا مگر کچھ عرصے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ مصحفی نے اس کے پاس جو کتب دیکھیں ان میں ایک دیوانِ اشعار، نظامی گنجوی کی خمسہ کا جواب، اثنا عشری عقائد سے متعلق ایک کتاب اور قصۂ چہار درویش شامل تھیں۔ بعد میں روہیلوں کی لوٹ مار میں اس کی سب کتابیں لُٹ گئیں۔ آخری وقت تک العجب دلی میں مقیم رہا اور وہیں

وفات پائی۔مرزا حامد بیگ نے چند وجوہات کی بنا پر انجب کو ہی قصّۂ چہار درویش کا مصنف بتایا ہے۔ان کے خیال میں قصّۂ چہار درویش کا مصنف کوئی شیعہ ہے جس نے جگہ جگہ حضرت علیؑ کو خلیفہ برحق قرار دیا ہے۔انجب بھی شیعہ تھا جس نے شیعہ عقائد پر ضخیم کتاب لکھی تھی جو مصحفی نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔قصّۂ چہار درویش میں جگہ جگہ مختلف مما لک کے حالات بیان کیے گئے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا مصنف کوئی ایسا شخص تھا جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔انجب کی زندگی کا بڑا حصہ سیاحت میں گذرا تھا اوران تمام مقامات پر قیام کر چکا تھا جن کا ذکر قصّہ چہار درویش میں آیا تھا۔اس کے علاوہ قصّۂ چہار درویش کی زبان میں جو عربی اور فارسی کی مہارت دکھائی دیتی ہے وہ انجب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔اس طرح کے دیگر دلائل سے مرزا حامد بیگ نے اس بات کی تائید کی ہے کہ انجب ہی فارسی میں قصّۂ چہار درویش کا مصنف ہے جس نے اپنے قیامِ دہلی میں یہ قصہ لکھا۔تحسین نے نوطرز مرصّع کی صورت میں اسے ازسرِ نوقلم بند کیا اور میر امّن نے اسے سامنے رکھ کر باغ و بہار مکمل کی۔

بعض محققین کے مطابق باغ و بہار اصل میں تحسین کی نو طرز مرصع کا ترجمہ ہے جب کہ بعض کے خیال میں یہ نو طرز مرصع کا ترجمہ نہیں بلکہ تسہیل شدہ صورت ہے۔مرزا حامد بیگ نے اس بات پر بھی تفصیلاً بحث کی ہے کہ باغ و بہار تحسین کی نوطرز مرصع کا من وعن ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس میں فورٹ ولیم کالج کی طرف سے دی گئی ہدایات کی روشنی میں بہت سی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ان کے مطابق باغ و بہار میں ایک ہی لفظ کے ایک سے زیادہ تلفظ استعمال کیے گئے ہیں تا کہ انگریز افسران ایک ہی لفظ کے وہ تمام تلفظ سیکھ سکیں جو ہندوستان میں اُس دور میں استعمال ہوتے تھے مثلاً king کے لیے باغ و بہار میں 'بادشاہ' اور 'پادشاہ' دونوں الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔باغ و بہار میں میر امّن نے جان بوجھ کر ایسے مواقع پیدا کیے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ رسومات اور الفاظ استعمال کیے جاسکیں۔مثلاً کھانے کی بات ہوتو درجنوں کھانوں کے نام لکھے گئے ہیں، اگر ملبوسات کی بات ہوتو تمام کے تمام ملبوسات کے نام لکھے گئے ہیں۔اسی طرح مہد سے لحد تک کوئی بھی رسم ایسی نہیں ہے جو باغ و بہار میں بیان نہ کی گئی ہو۔انگریزوں کو چونکہ برصغیر میں سنّی اور شیعہ دونوں

مسالک سے واسطہ پڑتا تھا، اس لیے میر امّن نے ایک شیعہ کردار بھی تراشا اور اس سے شیعہ مسلک کے عقائد اور طرزِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ اس کی روشنی میں انگریز شیعہ مسلک سے بھی واقف ہو سکیں۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اپنے مقالے کی روشنی میں میر امّن کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کو اس بات پر ہدفِ تنقید بنایا ہے کہ انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے مجموعے *Hindi Manual* (مطبوعہ ۱۸۰۲ء) اور باغ و بہار (۱۸۰۴ء) کے اولین سرورق پر مصنف/مترجم کے اصل نام کی بجائے میر امّن لکھا جس سے اصل شخصیت یعنی میر امان علی امّن دلّی والے کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ابہام پیدا ہوا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے میر امّن کی تاریخِ پیدائش کو گنجِ خوبی اور باغ و بہار کے مقدمات کے حوالے سے ۱۷۵۰ء قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> یوں ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ میر امّن پیدا ہوئے ہوں گے۔[۶]

اِس بات کو رشید حسن خاں نے یکسر مسترد کر دیا ہے اور کہا ہے کہ اب تک کوئی بھی ایسی ٹھوس شہادت موجود نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہم میر امّن کی تاریخِ پیدائش کا تعین کر سکیں۔

> اب تک ایسا کوئی ماخذ سامنے نہیں آیا جس کی مدد سے حالاتِ زندگی کی حد تک معلومات میں قابلِ قبول اضافہ ہو سکے۔ انتہا یہ ہے کہ ان کی ولادت و وفات کے سنین کا بھی علم نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ ان کا مدفن کہاں ہے؟[۷]

مرزا حامد بیگ کے میر امّن کی تاریخِ پیدائش ۱۷۵۰ء بیان کرنے کی وجہ رشید حسن خاں نے یہ بیان کی ہے کہ مرزا حامد بیگ نے چونکہ کسی میر امان علی دہلوی کو میر امّن دلّی والے ثابت کرنا تھا اس لیے انھوں نے جان بوجھ کر تاریخِ پیدائش ایسی بیان کی جس سے وہ فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے وقت کم عمر اور ۱۸۴۰ء تک زندہ ثابت ہو سکیں۔ ان کے مطابق:

> اس تعین کی ضرورت مقالہ نگار کو یوں پیش آئی کہ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ میر امّن بڑھاپے کے سبب فورٹ ولیم کالج سے ریٹائر نہیں کیے گئے تھے [جیسا کہ عتیق صدیقی نے معتبر حوالے سے لکھا ہے] بلکہ "گمانِ غالب ہے کہ میر امّن نے کالج کے بگڑتے

ہوئے حالات کے پیشِ نظر بروقت حیدرآباد کا رخ کیا ہو' اور یوں مقالہ نگار نے
نہایت آسانی کے ساتھ میر امّن کو نواب شمس الامرا کے قائم کردہ ''دارالترجمہ'' میں پہنچا
دیا، جہاں وہ مختلف سائنسی کتابوں کے ترجمے میں شریک رہے ـــ۔ اس لیے
ضروری تھا کہ کم از کم ۱۸۴۰ء تک زندہ رکھا جائے۔[۸]

اسی طرح انھوں نے میر امّن کے مسلک کو شیعہ قرار دیا ہے اور اس ضمن میں باغ و بہار کے دیباچے کا حوالہ دیا گیا ہے۔

باغ و بہار کے دیباچے کے سرسری مطالعہ سے ہی میر امّن کا شیعہ ہونا ثابت ہے۔[۹]

رشید حسن خاں نے بھی باغ و بہار کے دیباچے سے دو عبارتوں کا حوالہ دیا ہے جن میں بارہ امام اور چہاردہ معصومین کا حوالہ موجود ہے اور لکھا ہے:

ان عبارتوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعہ تھے۔[۱۰]

میر امّن شاعر تھے یا نہیں؟ ان کا تخلص کیا تھا؟ کیا ان کا تخلص امّن تھا یا لطف؟ باغ و بہار میں جو اشعار شامل ہیں وہ کس کے ہیں؟ ان سب امور پر مرزا حامد بیگ اور رشید حسن خاں میں واضح اختلاف موجود ہے۔ مرزا حامد بیگ نے میر امّن کے تخلص لطف پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ باغ و بہار میں جو اشعار شامل ہیں وہ مرزا علی لطف کے ہیں میر امّن کے نہیں۔ اس کی وجہ ان کے خیال میں یہ ہے:

باغ و بہار کے خاتمۂ کتاب میں مرزا علی لطف کے اشعار کی شمولیت کا ایک سبب یہ
بھی رہا ہوگا کہ لطف ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے بہت قریب تھے اور گل کرسٹ کی ہی
فرمائش پر انھوں نے علی ابراہیم خاں کے تذکرے شعرائے ہند گلزارِ ابراہیم
(سالِ تصنیف ۱۱۹۸ھ بمطابق ۱۷۸۴ء) کا فارسی سے اردو ترجمہ کیا اور تذکرہ
گلشنِ ہند نام رکھا۔[۱۱]

میر امّن کا تخلص امّن تھا نام نہیں، اس بات کو بھی رشید حسن خاں نے سختی سے مسترد کیا ہے۔ ان کے مطابق میر امّن کا تخلص لطف تھا جب کہ امّن ان کا صرف نام تھا۔

میر امّن شاعر بھی تھے، ان کا تخلص لطف تھا۔[۱۲]

اس کا ثبوت وہ آگے چل کر اس طرح دیتے ہیں:

گنج خوبی کے خطی نسخے کے آخری صفحے کی آخری سطر میں میر امّن نے اپنے قلم سے 'میر امّن لطف' لکھا ہے۔[۱۳]

انھوں نے مرزا حامد بیگ کی اس بات سے انکار کیا ہے کہ مرزا علی لطف گل کرسٹ کے بہت قریب تھے اس لیے ان کے اشعار باغ و بہار میں شامل کیے گئے۔

میر امّن کا تخلص لطف نہیں تھا۔ یہ بات قطعی طور پر درست نہیں۔ صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ میر امّن کا صرف ایک تخلص 'لطف' تھا اور ان اشعار کو مرزا علی لطف سے منسوب کیا گیا ہے وہ سب میر امّن لطف کے ہیں۔[۱۴]

فورٹ ولیم کالج سے وابستگی تک میر امّن کے حالات دستیاب ہیں لیکن فورٹ ولیم کالج سے فراغت کے بعد میر امّن کہاں گئے؟ یہ بات متنازعہ فیہ ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

یوں محسوس ہوتا ہے گویا قدیم زمانے کی مانند ایک داستان گو آیا، محفل کو رات بھر داستان سے برمایا اور صبح دم رخصت ہوگیا۔[۱۵]

رشید حسن خاں تو میر امّن کے جلد رخصت ہونے کے داعی ہیں لیکن مرزا حامد بیگ ان کو اس طرح رخصت کرنے پر تیار نہیں۔ انھوں نے چند دلائل سے ثابت کیا ہے کہ میر امّن فورٹ ولیم کالج چھوڑنے کے بعد فوت نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ حیدرآباد دکن کے دارالترجمہ سے منسلک ہو گئے تھے اور ۱۸۴۰ء تک حیات رہے۔ نصر اللہ قمر خورجوی کے تذکرے ہمیشہ بہار اور مولوی مجتبیٰ علی خاں کے تذکرے مواقیت الفواتح کے مطابق میر امّن ۱۸۰۲ء یا ۱۸۰۳ء میں فوت ہو گئے تھے۔ ان تذکروں کو رشید حسن خاں اور مرزا حامد بیگ دونوں نے مسترد کر دیا ہے۔ رشید حسن خاں اس بات کے قائل تو ہیں کہ میر امّن ۱۸۰۲ء یا ۱۸۰۳ء میں فوت نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کا ۱۸۰۶ء تک زندہ ہونا ثابت ہے لیکن وہ مرزا حامد بیگ کی اس دلیل کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں کہ میر امّن ہی میر امان لکھنوی تھے اور وہ فورٹ ولیم کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد دارالترجمہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے تفصیل سے بحث کی ہے کہ اگر فورٹ ولیم کالج سے انھوں نے پیرانہ سالی کی بنا پر ریٹائرمنٹ لی تھی تو اس کے پینتیس چھتیس سال بعد تک دارالترجمہ میں کام کیسے کرتے رہے۔ انھوں نے مرزا حامد بیگ

کے اس بیان کو بھی رد کر دیا ہے کہ میر امّن کی پیدائش ۱۷۵۰ء میں ہوئی اور وہ فورٹ ولیم کالج سے علاحدگی کے وقت صرف پچپن چھپن سال کے تھے۔

> یہ بہرحال ثابت ہے کہ میر امّن فورٹ ولیم کالج میں ۴ جون ۱۸۰۶ء تک کام کرتے رہے اور اسی مہینے میں سبک دوش کر دیے گئے۔ اس تاریخ تک وہ بقیدِ حیات تھے مگر اس کے بعد کا احوال معلوم نہیں۔ وہ کب تک زندہ رہے، کب انتقال ہوا، کہاں دفن ہوئے، ان میں سے کوئی بات معلوم نہیں۔ ۱۸۰۶ء میں جب وہ پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا عذر کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ عمر کے لحاظ سے وہ اس وقت بڑھاپے کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ محض قیاساً یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس وقت ان کی عمر پینسٹھ سال سے کم نہیں ہوگی۔ ستر سال سے بھی کچھ زیادہ ہو تو یہ بھی قرینِ قیاس رہے گی۔ بلکہ زیادہ قرینِ قیاس ہوگی مگر اس سلسلے میں قطعیت کے ساتھ فی الوقت تعین نہیں کیا جا سکتا۔[۱۲]

مرزا حامد بیگ کی رائے اس کے برعکس ہے۔ انھوں نے رشید حسن خاں کے دعوے کی شدت سے تردید کی ہے۔ ان کے مطابق ڈاکٹر گل کرسٹ نے جب کورٹ اوف ڈائریکٹرز کے ساتھ تنازعہ ہونے کے بعد ۱۸۰۴ء میں فورٹ ولیم کالج سے استعفیٰ دے کر برطانیہ کا رخ کیا تو نئی انتظامیہ آ گئی۔ اس انتظامیہ کا رویہ میر امّن کے ساتھ درشت تھا جس کی وجہ سے میر امّن نے پیرانہ سالی کا عذر کر کے ریٹائرمنٹ لے لی۔ پیرانہ سالی یا جسمانی کمزوری و بیماری وغیرہ صرف ایک بہانہ تھی بالکل اسی طرح جیسے ڈاکٹر گل کرسٹ نے جسمانی معذوری کی بنیاد پر استعفیٰ دیا مگر اس کے کئی سال بعد تک برطانیہ میں مصروفِ کار رہے۔ ان کے مطابق اس ریٹائرمنٹ کی اصل وجہ حیدرآباد دکن میں دارالترجمہ کا قیام تھا جہاں وہ ملازمت کرنا چاہتے تھے اور انھوں نے بعد میں واقعی وہاں ملازمت اختیار کر لی۔ اپنی وفات تک میر امّن، میر امان علی دہلوی کے نام سے حیدرآباد دکن میں کام کرتے رہے اور وہیں وفات پائی۔ اُن کی وفات تقریباً ۱۸۴۰ء کے لگ بھگ ہوئی ہوگی کیونکہ اس عرصے تک شائع کی گئی کتب پر میر امان علی دہلوی (میر امّن) کا نام مترجم کی حیثیت سے موجود ہے۔ حامد بیگ نے دارالترجمہ کی کتب کے تراجم کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ ان تراجم کی زبان باغ و بہار کی زبان کے بہت قریب ہے۔

> ......اس کے علاوہ اصول علم کے ترجمے میں میر امّن دہلوی کی لفظیات اپنی صاف پہچان کرواتی ہے مثلاً 'بغیر' کی بجائے 'بدوں'، 'باوجود' کی بجائے 'باوصف'، 'اس کے بعد' کی بجائے 'ترس پیچھے'، 'ضرورت' کی بجائے 'حاجت'، 'غلطی' کی بجائے 'خطا'، 'طریقہ' کی بجائے 'ڈول'۔[۱۷]

آخر میں مرزا حامد بیگ نے رشید حسن خاں سے ایک اہم سوال پوچھا ہے کہ اگر میر امن، میر امان علی دہلوی نہیں ہیں تو آخر وہ میر امان علی دہلوی کون ہیں جن کے نام کو مترجمین کی فہرست میں سب سے پہلے درج کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> رشید حسن خاں اور ڈاکٹر گیان چند رد کفر کے طور پر یہ ثابت تو کریں کہ ستیہ شمسیہ کا ایک ایسا مترجم میر امان علی دہلوی کون تھا جس کا نام بیاض متین کے مرتب غلام محی الدین متین حیدرآبادی، برطانوی مترجم جونس اور فرانسیسی ماہر لسانیات موسیوتنڈرس کے ناموں سے بھی پہلے لیا گیا ؟ کیا ان تین جانی مانی شخصیات کے ناموں سے پہلے میر امان علی کے نام کو درج کرنے میں مترجم کی کسی بڑی شناخت کو دخل نہیں؟[۱۸]

مرزا حامد بیگ نے ایک اور حوالہ رام بابو سکسینہ کی تاریخ اردو ادب کے حصۂ نثر سے باب اوّل میں میر امّن سے متعلق آخر سطر کا دیا ہے جس کے مطابق ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن نے خود میر امّن کی زبانی سنا تھا کہ ان کو کسی سے فنِ شعر میں تلمذ نہیں۔ اس ملاقات کا حوالہ محمد یحییٰ تنہا نے بھی سیر المصنفین میں دیا ہے۔ مرزا حامد بیگ کے مطابق فیلن کی پیدائش ۱۸۱۷ء بمقام کلکتہ ہے۔ اس نے ۱۸۳۷ء میں بیس سال کی عمر میں محکمۂ تعلیم بنگال میں ملازمت اختیار کی تھی۔ یہ ملاقات لازماً اس کے بعد ہوئی ہوگی۔ اگر میر امّن ۱۸۰۶ کے کچھ عرصے بعد فوت ہو گئے تھے تو پھر فیلن سے ملاقات کس نے کی؟ اس بنیاد پر انھوں نے میر امّن کو ۳۷-۱۸۳۶ء تک زندہ ہونا ثابت کیا ہے۔

میر امّن کے اہلِ خانہ اور اولاد کے بارے میں بھی دونوں نسخوں میں بہت دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ میر امّن کی زندگی کے اور بہت سے پہلو جہاں پردۂ خفا میں ہیں وہاں ان کے اہلِ خانہ کے بارے میں بھی زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ رشید حسن خاں نے باغ و بہار کے دیباچے کا حوالہ دیا ہے:

> نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پانو پھیلا کر سو رہتا ہوں؛ اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دعا اس قدر دان کو کرتے ہیں۔[19]

رشید حسن خاں اس کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ میر امن صاحبِ عیال و اطفال تھے اور گھر میں چھوٹے بڑے دس آدمی تھے۔ اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہیں۔ مرزا حامد بیگ نے لکھنؤ کے مشہور ریختی گو جان صاحب کو میر امن کا بیٹا بتایا ہے اور اس ضمن میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے دعوے کی بنیاد دو تذکروں پر ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے عبدالغفور نساخ کے تذکرے سخن شعرا کا حوالہ دیا ہے۔

> جان صاحب میر یار علی خلفِ میر امن لکھنوی، شاگرد عاشور علی خاں بہادر۔ ریختی اپنے طرز پر خوب کہتے تھے۔

اس کے بعد انھوں نے سید محمد مبین کی مرتب تاریخ ریختی مع دیوانِ جان صاحب کا حوالہ دیا ہے۔

> جان صاحب کی ولادت فرخ آباد میں غالباً ۱۲۳۴ھ (۱۹–۱۸۱۸ء) میں ہوئی تھی۔ نام تو ان کا میر یار علی تھا مگر والدین پیار سے جان صاحب کہتے تھے۔ ان کے والد میر امن تو فرخ آباد کے رہنے والے تھے لیکن یہ بچپن ہی میں لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔

اس کے علاوہ مرزا حامد بیگ نے مشہور مستشرق گارساں دتاسی کی فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تاریخ ہندوی و ہندوستانی جلد دوم (نظر ثانی شدہ ایڈیشن) مطبوعہ پیرس، طبع اوّل (۱۸۷۰ء) کے حوالے سے لکھا ہے:

> جان (میر یار علی جان صاحب) محسن کے تذکرے میں اسے 'ریختی کی جان' کہا گیا ہے۔ جان صاحب کو 'جی صاحب' کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک پڑھی لکھی خاتون، میر امن کی بیٹی تھی اور فرخ آباد میں پیدا ہوئی لیکن زیادہ تر لکھنؤ میں رہی جہاں اس نے ادبی شہرت حاصل کی۔[20]

مرزا حامد بیگ نے لکھا ہے کہ اگرچہ گارساں دتاسی کو ریختی کی زبان سے اس بات کا دھوکہ ہوا ہے کہ جان صاحب عورت تھی لیکن ان کی یہ بات بالکل درست ہے کہ ان کے والد میر امن دہلوی

تھے۔ جان صاحب کی پیدائش فرخ آباد میں اس وقت ہوئی جب وہ فورٹ ولیم کالج چھوڑ کر وہاں مقیم تھے۔ اس کے بعد وہ بطور مترجم دارالترجمہ شمس الامرا حیدر آباد دکن چلے گئے۔ انھوں نے اہل وعیال کو لکھنؤ میں چھوڑا اور خود دارالترجمہ میں کام کرتے رہے۔ ان کے اسی تعلق کی وجہ سے نساخ نے بھی ان کو میر امن لکھنوی لکھا تھا۔ تاہم ان سب دلائل کو رشید حسن خاں نے بیک جنبشِ قلم مسترد کرتے ہوئے لکھا ہے:

> مقالہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب ایسے مفروضات کا سلسلہ ہے جس کی ایک کڑی بھی درست نہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی قابلِ قبول نہیں۔ ان کو ایک جگہ 'میر امان علیؒ کے نام نے مغالطے میں مبتلا کیا اور دوسری جگہ 'میر امن' نے۔ جو کچھ انھوں نے لکھا اس میں سے کسی ایک بات کا بھی ثبوت نہ ان کے پاس ہے اور نہ کہیں موجود ہے۔ محض مفروضات جو 'کہا جاسکتا ہے' جیسے فقروں کے تحت معرضِ اظہار میں آئے ہیں۔[۲۱]

رشید حسن خاں کو یقیناً کسی بھی رائے کو منظور یا مسترد کرنے کا اختیار ہے لیکن اگر وہ مرزا حامد بیگ کی اس رائے کو مسترد کرنے کی وجوہات بھی بیان کر دیتے یا ایسے جوابی دلائل پیش کرتے جن سے مرزا حامد بیگ کے دلائل کا رد ہوجاتا تو زیادہ بہتر ہوتا اور پڑھنے والوں کو بھی یقیناً کسی کمی کا احساس نہ ہوتا۔

باغ و بہار کے بارے میں ایک عام رائے یہ ہے کہ باغ و بہار کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ رشید حسن خاں بھی اس چیز کے قائل ہیں کہ میر امن کا انداز سادہ اور صاف ہے۔

> میر امن کی نثر نے روزمرہ اور محاورے کی قدر و قیمت کو واضح کیا، بیان میں سادگی اور صفائی کی ناگزیر ضرورت کا احساس دلایا۔[۲۲]

مرزا حامد بیگ نے اس سے اختلاف کیا ہے اور یہ رائے دی ہے کہ باغ و بہار کی زبان کا جائزہ یہ بتاتا ہے کہ اس کو سادہ اور سلیس کہنا درست نہیں ہے۔

> میر امن کا اسلوب یکسر سادہ و سلیس ہرگز نہیں۔ اس میں سجع متوازن، سجع متوازی اور سجع مطرّف کے علاوہ قوافی کا ایک خاص نظام دکھائی دیتا ہے جس سے میر امن کی نثر

میں ایک خاص طرح کے آہنگ نے جنم لیا اور اس آہنگ کی بنیاد حرکت پر ہے جسے میر امّن نے ہر قیمت پر برقرار رکھنے کے لیے جمع الجمع (سلاطینوں، امراؤں) اور یک لفظی سطح پر عوامی تلفظ (مہربانگی، لنبا، ٹھنڈھک، بھجایا، ماباپ، بھوکھ، پیاری، بھتے) کو برتا۔ یوں میر امّن کے اسلوب کو محض 'سادہ و سلیس' کہنے سے اس تخلیقی توانائی کا حق ادا نہیں ہوتا جو باغ و بہار میں پائی جاتی ہے۔[۲۳]

مرزا حامد بیگ کے بیان کی بنیاد غالباً ان تبدیلیوں اور اضافوں پر ہے جو میر امّن نے انگریز افسروں کی فرمائش پر کیے تھے وگرنہ میر امّن نے خود اس قصے کے دیباچے میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کو ڈاکٹر گل کرسٹ نے قصے کو سلیس زبان میں لکھنے کی تلقین کی تھی تاہم ضرورت کے مطابق ان کو ایسے اضافے کرنا پڑے جو ناگزیر تھے۔

باغ و بہار کے مقدمے میں مرزا حامد بیگ نے باغ و بہار کی اسلوبیاتی ساخت پر بھی بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق میر امّن نے باغ و بہار میں عوامی بول چال کا لہجہ اور ذخیرۂ الفاظ جمع کیے، جس کی ایک مثال صرف نظیر اکبر آبادی کے ہاں ملتی ہے۔

میر امّن نے عوامی بول چال کا لہجہ اور ذخیرۂ الفاظ سمیٹنے کا جتن کیا۔ لفظیات کے سبب مجھے تو ایک ہی شاعر ایسا دکھائی دیتا ہے جو میر امّن (م: ۱۸۳۶ء) سے قریب ہے اور وہ ہے ولی محمد نظیر اکبر آبادی (م: ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء)۔[۲۴]

اس کے ساتھ ساتھ مرزا حامد بیگ نے باغ و بہار کی نثری بنت، تذکیر و تانیث، واحد جمع، جمع الجمع، محاورات، مترادفات، مبتدا و خبر، خلافِ محاورہ، خلافِ لغت مضاف، مضاف الیہ، اضافتِ توصیفی، صنائع بدائع کے معاملات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

متن کی تدوین کے دوران مرزا حامد بیگ نے املا میں بڑی تبدیلیوں سے احتراز کیا ہے۔ کچھ جگہوں پر 'یہ' کو 'یے' کر دیا گیا ہے۔ میر امّن کے املا لیئے، کیئے، دکھایئے، رکھیئے، کیجیے، چلیے وغیرہ کو برقرار رکھا ہے۔ میر امّن کئی جگہ پر 'ز' کی جگہ 'ذ' استعمال کرتے ہیں جس کو بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ اسی طرح بعض جگہ ایسی املا کو جواب متروک ہے برقرار رکھا گیا ہے مثلاً 'سنئے' کی جگہ میر امّن نے 'ستے' اور 'اس سے' کی جگہ 'اتے' استعمال کیا ہے جس کو مرزا حامد بیگ نے برقرار رکھا ہے۔

دوسری طرف املا چونکہ رشید حسن خاں کا پسندیدہ موضوع تھا جس پر ان کی کئی کتابیں سامنے آچکی ہیں اس لیے انھوں نے باغ و بہار کے دیباچے میں املا، اسلوب اور زبان پر کھل کر بحث کی ہے۔ رشید حسن خاں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے اس نظامِ املا کا تفصیل سے تعارف کروایا ہے جس کا التزام فورٹ ولیم کالج کی تمام کتب میں ملتا ہے۔ اضافت کہاں کہاں اور کس کس صورت میں استعمال ہوئی؟ یاے معروف و مجہول کو کیسے برتا گیا؟ حرکات میں کیا فرق ملتا ہے؟ قوسین کب اور کہاں ملتی ہیں؟ ہاے ملفوظی اور ہاے مختفی کے کیا مسائل درپیش ہیں، پیراگراف کتنے اور کس طرح بنائے گئے؟ ان کو کس طرح الگ کیا گیا؟ ان سب سوالوں پر درجنوں صفحات میں بحث کی گئی ہے جس سے نہ صرف اس دور کے اندازِ تحریر کے بارے میں بیش بہا معلومات ملتی ہیں بلکہ اس عرق ریزی پر بھی داد دینے کو جی چاہتا ہے جو تدوین کے دوران رشید حسن خاں نے کی۔

باغ و بہار ہر عہد کی داستان ہے اور اس پر ہر عہد میں کام ہوا ہے۔ یہ کام آگے بھی جاری رہے گا۔ ہر دور میں نئے حقائق سامنے آتے رہیں گے اور محققین ان پر تحقیق بھی کرتے رہیں گے۔ کون جانے آنے والے وقت میں پھر کوئی رشید حسن خاں اور مرزا حامد بیگ سامنے آجائیں جو تحقیقی اختلافات کے ذریعے بعد میں آنے والوں کے لیے تحقیق کے نئے دروازے کھول جائیں جیسے ان دونوں قابل احترام محققین نے کیا ہے۔ تحقیق کا یہی حسن ہے کہ اس میں کیا جانے والا کوئی بھی کام حتمی نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک اور کام کی بنیاد رکھ جاتا ہے۔ یہ سلسلہ شروع سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔

حواشی و حوالہ جات

* نگرانِ تحقیق، شعبۂ فارسی، جی سی یونی ورسٹی، لاہور۔

** اسکالر پی ایچ ڈی اردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

۱۔ گیان چند، تحقیق کا فن (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۷۹۔

۲۔ مرزا حامد بیگ، مقدمہ باغ و بہار از میر امن (لاہور: اُردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۴ء)، ص ۹۷۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۰۔

۴۔ حافظ محمود شیرانی، "قصۂ چہار درویش"، مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد ۹، مرتبہ مظہر محمود شیرانی (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۳۸۔

۵۔ رشید حسن خاں، مقدمہ باغ و بہار از میر امّن دہلوی (نئی دلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۹۲ء)، ص ۲۶۔

۶۔ مرزا حامد بیگ، ص ۱۸۔

۷۔ رشید حسن خاں، ص ۴۴۔

۸۔ ایضاً، ص ۲۷۔

۹۔ ایضاً، ص ۲۰۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۶۔

۱۱۔ مرزا حامد بیگ، ص ۱۵۔

۱۲۔ رشید حسن خاں، ص ۳۰۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۲۔

۱۴۔ ایضاً۔

۱۵۔ سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ص ۳۱۴۔

۱۶۔ رشید حسن خاں، ص ۴۳۔

۱۷۔ مرزا حامد بیگ، ص ۴۳۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۸۔

۱۹۔ رشید حسن خاں، ص ۳۶۔

۲۰۔ مرزا حامد بیگ، ص ۵۹۔

۲۱۔ رشید حسن خاں، ص ۳۸۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۲۳۔ مرزا حامد بیگ، ص ۹۵۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۸۸۔

مآخذ

اختر، سلیم ۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء۔

جین، گیان چند۔ تحقیق کا فن۔ لاہور: سنگھ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔

حامد بیگ، مرزا۔ مقدمہ باغ و بہار از میر امن۔ لاہور: اُردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۴ء۔

خاں، رشید حسن ۔ مقدمہ باغ و بہار از میر امّن دہلوی نئی دلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۹۲ء۔

شیرانی، حافظ محمود۔ "قصۂ چہار درویش" ۔ مقالات حافظ محمود شیرانی ۔ جلد ۹ ۔ مرتبہ مظہر محمود شیرانی ۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۹ء، ص ۱۱۴–۱۳۹۔